جلد ۹۲ دسمبر ۱۹۷۹ء عدد ۴

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

جلد ۹۲ | دسمبر ۱۹۷۹ء مطابق محرم ۱۴۰۰ھ | عدد ۴



ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر —— ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ بیس روپے ۔ فی پرچہ ۲/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

مسلکِ خدا پرستی کی عظیم ظاہری علامت اور توحید کا دارالمرکز اور ملّتِ اسلامیہ کے دائرے کا نقطۂ وسطی ہونے کے لحاظ سے اس کرۂ خاکی پر جو مقام کعبۃ اللہ مبارکہ، مسجد بیت اللہ شریف اور حرمِ مکیہ کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری عمارت، ادارے، معبد یا شہر کو حاصل نہیں ہے — دوسرے تمام مبارک اور مقدس مقامات کا اپنا اپنا درجہ اور مرتبہ ہے۔

عقیدہ و شعور کے بعد جو ظاہری چیزیں ہم مسلمانوں کے ایمان و عرفان کو جلا دیتی اور ہمارے رشتۂ وحدت کو مستحکم کرتی ہیں، وہ قرآن کریم، حرمِ مکہ اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ اور مسجد تین چیزیں ہیں۔ یہ تین چیزیں ہی تجلیاتِ الٰہیہ کو پردۂ مادیت پر منعکس کرتی ہیں۔ ان کی عزت ان کی سربلندی، ان کے امن اور ان کی آبادی و رونق پر ہماری سربلندی، ہمارے امن، ہماری آبادی و بقا اور ہمارے رشتۂ وحدت و اتحاد کا انحصار ہے۔

ان تینوں مقدس مظاہر کے اعزاز و اکرام کے خاص احکام ہیں۔

اس وقت ہم کعبۃ اللہ اور حرمِ مکہ کے حقِ تعظیم پر گفتگو کر رہے ہیں۔

حرم مکہ یا بیت اللہ کے متعلق قرآن میں یہ نہایت جامع امتناعی ہدایت دی گئی ہے:

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (الحج - ۲۵) | اس (مسجدِ حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا، اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے (ترجمہ از تفہیم القرآن) |

راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرنے کا مفہوم بھی ہم تفہیم القرآن ہی کے تفسیری حاشیے سے پیش کرتے ہیں:-

"اس سے ہر وہ فعل مراد ہے جو راستی سے ہٹا ہوا ہو اور ظلم کی تعریف میں آتا ہو، نہ کہ کوئی خاص فعل۔ ان عام گناہوں کے علاوہ حرم کی حرمت کے متعلق جو خاص احکام ہیں اُن کی خلاف ورزی بدرجۂ اولیٰ اس تعریف میں آتی ہے۔

حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو، اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے، تو جب تک وہ وہاں رہے اُس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا..... حضرت عمرؓ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے یہ اقوال معتبر روایات میں آتے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اُسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جمہور تابعین اور حنفیہ اور حنابلہ اور اہل حدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جرم کا قصاص حرم میں نہیں لیا جائے گا[۱] وہاں جنگ اور خونریزی حرام ہے[۲]۔

فتح مکہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔ اس میں آپ نے اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! اللہ نے مکہ کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے۔ پھر فرمایا کہ: اگر میری اس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خونریزی کو جائز ٹھہرائے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمہارے لیے، اور میرے لیے بھی یہ صرف

---

[۱] قصاص ہی نہیں، راقم ناچیز کی دانست میں اُسے گرفتار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حرم سے باہر نکلنے پر اُسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مسجد بیت اللہ ہر اس شخص کے لیے جائے امن ہے جو اس میں داخل ہوا (ف۔ص)

[۲] ماسوا اس کے کہ کوئی گمراہ فریق حرم میں مسلح ہو کر خونریزی کرنے کے لیے جائے یا مورچہ بندی کر کے حملے کا آغاز کر دے۔ (ف۔ص)

ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا تھا، پھر آج اس کی حرمت اسی طرح قائم ہوگئی، جیسی کل تھی" (حاشیہ نمبر ۴۴ ۔ سورۂ حج)

مزید یہ کہ احادیث کی روشنی میں بہ مطابق تحریر صاحب تفہیم القرآن چند اور چیزیں ممنوع ہیں۔

"وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جاسکتا۔ نہ خودرو گھاس اکھاڑی جاسکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا جاسکتا ہے، اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جاسکتا ہے تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ اور ان کو عین حالت نماز میں بھی مارا جاسکتا ہے۔ (اور خودرو گھاس سے اذخر اور خشک گھاس مستثنیٰ کی گئی ہے۔

وہاں کی گری پڑی چیز اٹھانا ممنوع ہے...... وہاں جو شخص بھی حج یا عمرے کی نیت سے آئے وہ احرام کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا" (حاشیہ ۴۴ ۔ سورۂ حج)

اسی آیت پر ابن کثیر میں مختلف روایات سے استفادہ کرتے ہوئے مزید کئی باتیں مذکور ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ اصول حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی شخص کا معاصی کبیرہ میں سے کسی بیہودہ حرکت کا عزم کرنا یعنی اس غرض کے لیے عمد وقصد کا پایا جانا یا بروایت ابن عباس تعمد کا ہونا، کیونکہ آیت میں "من یرد" کے الفاظ ہیں۔ یعنی جس کسی نے ارادہ کرلیا۔ یہ ارادہ و عمد بعض طرح کے افعال کے لیے باعث عذاب الیم ہے، ان میں سے مثلاً ایک بروایت ابن عباس شرک یا بالفاظ مجاہد غیر اللہ کی عبادت ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ ہی کی یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ ظلم سے یہاں مراد حرم کو برائی اور قتل کے لیے حلال کرنا ہے۔ مجاہد کا ایک قول یہ ہے کہ حرم میں کسی ناپسندیدہ عمل کا ارتکاب ظلم ہے اور یہ کچھ حرم کی خصوصیت ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے حدود میں ظلم کا آغاز کرنے چلے تو وہ گرفت میں آجاتا ہے۔ محض برائی کا عزم و عمد کارفرما ہونا کافی ہے، خواہ وہ اسے جامۂ عمل نہ پہنا سکے۔ ابن مسعودؓ ایسے آدمی کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ضرور عذاب الیم کا مزہ چکھائے گا۔ حرم میں کسی شخص کے محض قتل کی رغبت کرنا بھی تعریف ظلم میں داخل ہے۔ سعید بن جبیرؓ تو یہاں تک جاتے ہیں کہ اپنے خادم کو ملامت یا رجز و توبیخ کرنا بھی ظلم میں داخل ہے۔ حبیب ابن ابی ثابت کے الفاظ میں مکہ میں احتکار کرنے والا ظالم

کی تعریف میں داخل ہے۔ یعلیٰ بن امیہ نے تو رسولؐ خدا سے روایت کیا ہے کہ مکہ میں طعام (غذائی سامان) کا احتکار کرنا الحاد (کی تعریف میں داخل) ہے۔ ایک شخص اسلام سے مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا اور حرم میں جا پناہ لی۔ بعض نے اس واقعہ کو متذکرہ آیت کا شانِ نزول قرار دیا۔ یعنی اسلام سے فرار کرنے والے کی حیثیت وَمَن يُّرِدْ فِيهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ سے مطابقت رکھتی ہے۔ حرم مخالفین و مرتدین اسلام کے لیے پناہ گاہ نہیں جو الحاد و ظلم کے راستے پر پڑ چکے۔ ابن کثیر بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ یہ جتنی مثالیں مذکور ہوئیں، اُن سے آیت زیرِ نظر زیادہ وسیع الاطلاق ہے۔[1]

---

علاوہ ازیں قرآن کریم نے بعض بنیادی جرائم کا ذکر کیا جو حرم میں زیادہ بڑے گناہ کا باعث ہوتے ہیں اور الحاد و ظلم کی تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً البیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ وضاحت بواسطہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ "لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا" یعنی میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ (الحج-۲۶) وَطَهِّرْ بَيْتِيَ ...... (یعنی میرے گھر کو (شرک، گناہ اور ظاہری غلاظتوں سے) پاک کر کے رکھو۔ (الحج-۲۶) اس کے بعد وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ یعنی لوگوں کو حج کے لیے دعوتِ عام دو ــــ شرک اور گندگی سے حرم کو پاک رکھنے کی ہدایت کے بعد تیسرا حکم یہ بتایا ہے کہ عام لوگوں کو دعوت حج دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے حج بیت اللہ میں کوئی روک ٹوک نہ ہو، اُن کو امن حاصل ہو، اور ملکوں اور نسلوں اور مالی حالات کے لحاظ سے اُن میں کوئی تمیز و تفریق نہ کی جائے۔ پھر آگے جا کر یہ فرمایا کہ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ یعنی جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اس کے لیے بہتر ہے۔ (الحج-۳۰) دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص

---

[1] مفسرین کے ہاں ایک اور بحث بھی اسی مسئلے کے متعلق یہ ملتی ہے کہ اہل مکہ کو حاجیوں کے لیے گھروں کے دروازے کھول دینے چاہییں اور ان سے کرایہ وصول نہیں کرنا چاہیے اور نہ قیمت طعام لی جانی چاہیے ورنہ ظلم ہوگا۔ اس سلسلے میں محدثین و فقہا نے بحثیں کر کے اس انتہاپسندانہ نقطۂ نظر کی کمزوری واضح کر دی ہے۔ یہاں تذکرہ غیر ضروری ہے (ن ر ص)

خدائی حرمات کی تعظیم نہیں کرتا یا اُن کا درجہ گھٹاتا یا اُن کو پامال کرتا ہے تو وہ الحاد و ظلم کا مجرم ہے اور خدائی حرمات میں حرم کی حرمت کے بعد، انسانی جان، مال اور آبرو کی حرمت انتہائی اہم ہے جیسا کہ قرآن کی تشریح میں خطبۂ حج الوداع میں حضورؐ نے شدید تاکید کی۔ پھر آگے چل کر حکم امتناعی ہے کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ یعنی "بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو"۔ (الحج - ۳۰) مزید یہ بات چاہی گئی ہے کہ حرم کے حاجیوں اور عبادت گذاروں کو حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ کی کیفیت میں ہونا چاہیے۔ یعنی پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کے بندے ہو کے عبادت کریں اور شرک نہ کریں۔ (الحج - ۳۱) یہ صریح طور پر قرآنی ممنوعات ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تمام چیزیں ویسے بھی شرعاً ممنوع ہیں، مگر بیت اللہ شریف یا جوارِ حرم میں ان کا ارتکاب بہت زیادہ بڑا جرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ گھر اپنی نور افروز تاریخ اور بابرکت فضاؤں کی وجہ سے قلب و نظر کے لیے ایک تربیتی مرکز ہے۔ اگر اس مرکز کو بگاڑ دیا جائے تو پھر وہ بات ہوگی کہ "چو کفر از کعبہ برخیزد"!

اسی سورۂ حج میں جہاں بڑا اہم مطالبہ تعظیم حرم کا ہے وہاں اسی کے ساتھ تعظیم حرمات اللہ کی تاکید کی گئی ہے۔ پھر دوسری جگہ تعظیم شعائر اللہ کا حکم ہے۔ دراصل شعائر اللہ ہی سے دین کا سارا تانا بانا بنتا ہے۔ نومولود کے کان میں اذان کہنے سے لے کر کفن دفن تک، اور وضو اور ڈاڑھی سے لے کر طواف اور قربانی تک جا بجا شعائر اللہ کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اگر شعائر اللہ کی حرمت و تعظیم قائم رہے تو دین قائم رہتا ہے، اگر یہ چیز ضائع ہو جائے تو دین کو بچایا نہیں جا سکتا۔ شعائر اللہ کا تمسخر اڑانا، شعائر اللہ کو بے وقعت سمجھنا اور شعائر اللہ کو ترک کرنا یا اُن پر کسی دوسرے طور طریق کو ترجیح دینا تقاضائے دین کے خلاف ہے۔ آیات اللہ اور حدود اللہ کے بعد شعائر اللہ کی بے حد اہمیت ہے۔ یہ اسلامی معاشرت و تہذیب کے ایسے مظاہر ہیں جن کے ذریعے ہمارے عقائد و تصورات محسوس شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔ متعلقہ ایمان افروز آیت ملاحظہ ہو:۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج: ۳۲)

اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ (ترجمہ از تفہیم القرآن)

---

اب ذرا وہ جامع تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو، جو صاحب تفہیم القرآن نے شعائر اللہ کی حقیقت واضح کرنے کے لیے لگایا ہے:۔

ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرزِ فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو، وہ اس کا شعار کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں، اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے۔ سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنی ہے۔

.....شعائر اللہ سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں، مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ اُن کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جز رکھتا ہے تو اُس جز کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان

شعائر کا بھی احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہو، اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے[1]۔

..... احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدہ کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے[2]۔

حرم، بیت اللہ اور شعائر اللہ کی حرمت و تعظیم کے سلسلے میں احکامِ قرآنی آپ کے سامنے آ گئے۔ اب اگر آپ سورۃ الحج کی آیت ۲۵ کو غور سے ملاحظہ کریں جس میں حرم اور بیت اللہ میں الحاد و ظلم کا رویہ اختیار کرنے والوں کے لیے عذاب الیم کی وعید آئی ہے، تو اندازہ ہوگا کہ یہ آیت قرآن کی اُن چند سخت ترین آیات میں سے ہے جو خوف سے لرزا دینے اور کپکپا دینے والی ہیں۔

---

## (۲)

تاریخی طور پر عظمتِ حرم کو مجروح کرنے کے لیے جو اقدامات ہوئے، اُن میں سے سب سے پہلا، بڑا اور مشہور واقعہ اصحاب فیل کا ہے۔

۵۲۵ء میں قسطنطنیہ کی رومی حکومت کی پشت پناہی سے حبش کی حکومت یمن میں قائم ہو گئی۔ حملۂ اصحابِ فیل کے وقت ابرہہ یمن میں حکومت حبش کا نائب السلطنت تھا۔ یہ شخص حکومت حبش کی برائے نام بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے آہستہ آہستہ علاقہ یمن کے پورے حاکمانہ اختیارات پر قابض ہو گیا۔ اُس نے یمن کے دارالحکومت صنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا نام عرب مؤرخین نے (باقی بر صفحہ ۴۰)

---

[1] تفہیم القرآن۔ سورۂ مائدہ۔ حاشیہ ۵ [2] ایضاً حاشیہ ۶

# تذکرۂ انبیاء علیہم السلام

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

سید مودودی مغفور کی منظوری اور اُن کی رہنمائی میں دو کام کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ دین کی نہایت اہم ضرورتیں پوری ہوگئیں۔ ایک "سیرتِ سرورِ عالم" (۳ حصص) کی ترتیب اور دوسرے "تذکرۂ انبیاء" علیہم السلام کی تدوین دو جلدوں میں۔ تذکرۂ انبیاء بہت اہم کتاب ہے اور اسلامک پبلی کیشنز کے ذریعے جلد ہی شائع ہوسکے گی۔ یہ بھی مولانا مغفور کی اپنی ہی تحریروں سے ترتیب یافتہ ہے۔ اِن کاموں میں مجھے مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کا تعاون حاصل رہا۔

کئی مرتبہ خیال آیا کہ سید مغفور کی اپنی کچھ پرانی چیزیں ترجمان القرآن میں چھپتی رہیں۔ اب اس خیال کو جامۂ عمل پہنانے کی صورت بن رہی ہے۔ تذکرۂ انبیاء میں سب سے پہلا باب، یعنی قصۂ آدم علیہ السلام کی پہلی قسط دی جارہی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سلسلہ اب چلتا رہے گا۔ اس دوران میں عام اور اہلِ ذوق مطالعہ کرتے ہوئے مفید مشوروں سے نوازیں اور جہاں بھی کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہو، نشاندہی کریں۔ (ن۔ ص)

## باب ــــ آدم علیہ السلام

فصل ۱ - انسانِ اوّل۔

فصل ۲ - آغازِ انسانیت کا قرآنی بیان اور نظریۂ ارتقاء۔

فصل ۳ - زندگی کا ظہور اندھا حادثہ نہیں!

فصل ۱

# انسانِ اوّلؑ

سوال (ا) قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر جس انداز سے کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ نوعِ بشری کے یہ سب سے پہلے رکن بڑے ہی مہذب تھے۔ اس سلسلہ میں جو چیز میرے ذہن میں خلش پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس متمدن انسان کی صُلب سے وحشی قبائل آخر کس طرح پیدا ہو گئے؟ تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبائل اخلاق اور انسانیت کی بالکل بنیادی اقدار تک سے ناآشنا ہیں۔ نفسیات بھی اس امر کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وحشی انسانوں اور حیوانوں کے مابین کوئی بہت زیادہ فرق نہیں۔ سوائے اس ایک فرق کے کہ انسان نے اپنی غور و فکر کی قوتوں کو کافی حد تک ترقی دے دی ہے۔ یہ چیز نظریۂ ارتقا کو تقویت پہنچاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر میری اس خلش کو دُور کریں گے۔ اور اس امر کی وضاحت کریں گے کہ ابتدائی انسان کی تخلیق کی نوعیت کیا تھی۔ اور اس کے جبلی قویٰ کس سطح پر تھے!

(ب) حضرت آدم تاریخ کے کس دور میں پیدا ہوئے؟ اس ضمن میں مذہب جو معلومات ہمیں فراہم کرتا ہے نفسیاتی اور ارضیاتی حقائق ان کی تائید نہیں کرتے۔ کیا آدمؑ اور حوّا کا یہ قصہ ایک تمثیل اور مجازی چیز نہیں؟

## حضرت آدم کی تخلیق اور تربیت

میں حضرت آدمؑ کو نوعِ انسانی کا پہلا فرد سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پہلے فرد کی براہِ راست تخلیق (DIRECT CREATION) کی گئی تھی۔ اور یہ کہ اس فرد کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ نہیں دیا گیا کہ خود ہاتھ پاؤں مار کر فکری اور عملی تہذیب کی جانب پیش قدمی کرے۔ بلکہ اسے خداوند تعالیٰ کی رہنمائی و

---

ؔلہ یہ طویل عبارت ایک مستفسر کے جواب میں لکھی گئی۔ (مرتبین)

نگرانی میں وہ ابتدائی تربیت بھی دی گئی جو تہذیبِ انسانی کی داغ بیل ڈالنے کے لیے لازماً درکار تھی۔ آپ غور کریں تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہر نوع کے افراد کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے کچھ بنیادی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ حیوانات کے افراد کو یہ رہنمائی بہت کم اور محدود پیمانے پر درکار ہوتی ہے۔ اور وہ ہر بچہ حیوان کو بالعموم اس کے ماں باپ، یا دوسرے افرادِ نوع سے ملتی ہے۔ انسان کا بچہ اس سے بہت زیادہ اور بڑے پیمانے پر نگہبانی و رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ جو اگر نہ ملے تو وہ یا تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا یا بچہ انسان کی حیثیت سے نشو و نما نہیں پا سکتا۔ یہ ابتدائی اور ضروری رہنمائی میرے نزدیک ہر نوع کے پہلے فرد کو، اور اسی طرح نوعِ انسانی کے بھی اوّلین فرد کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اللہ کی طرف سے دی گئی تھی۔

## انسان کبھی تہذیب سے عاری نہ تھا

یہ بات کہ انسان کبھی تہذیب سے بالکل عاری اور اپنی حالت میں پوری طرح حیوانات کی سطح پر تھا، محض ایک مفروضہ ہے جو اس دوسرے مفروضے پر قائم کیا گیا ہے کہ انسان حیوانات میں سے ترقی کرتا ہوا حالتِ انسانی کو پہنچا ہے۔ اس وقت تک مشاہدات میں کوئی چیز ان دونوں مفروضات کی تائید کرنے والی، تائید اس معنی میں کہ انھیں ثابت کر دے، نہیں ملی ہے۔ اس کے برعکس قدیم ترین آثار میں بھی جہاں کہیں انسان کا نہ کہ خیالی مفقود حلقہ (MISSING LINK) ملا ہے۔ وہیں تہذیب کے بھی نشانات ملے ہیں۔ چاہے وہ کیسے ہی ابتدائی مرحلے میں ہوں۔ خالص غیر مہذب و غیر متمدن انسان مثلِ حیوان اب تک کہیں نہیں پایا گیا ہے۔ جن کو آپ غیر متمدن کہتے ہیں۔ ان میں اور حیوانی زندگی کی برتر صورتوں میں اگر واقعی تقابل کیا جائے تو ایسے بنیادی فرق پائے جائیں گے کہ حیوان کی کسی اونچی سے اونچی قسم کو انسان کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ وحشیانہ حالت سے بھی کوئی نسبت نہ ہوگی۔ یہ دراصل ادّعائے خوئیلہ ہے جس کی وجہ سے کچھ سطحی تشابہات کو انسان و حیوان میں مماثلت کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔

## نوعِ انسانی کے مستقل امتیازی اوصاف

بالکل ابتدائی حالت میں بھی چند چیزیں ایسی ہیں جو قطعی طور پر انسان و حیوان میں فرق کر دیتی ہیں۔ مثلاً حیا، جس کا اظہار اعضائے صنفی کو چھپانے اور مباشرت میں اخفا سے کام لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ الفاظ و اشارات کی شکل میں اظہارِ خیال، جو حیوانات کی آوازوں سے بالکل بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ قوتِ ایجاد، جو حیوانات کی جبلت کے تحت لگی بندھی صفتوں سے کلیتہً اپنی نوعیت میں بالکل ایک مختلف

چیز ہے۔ ارادی و غیر ارادی افعال میں فرق کرنا، اور ارادی افعال پر اخلاقی احکام لگانا، حیوانات کی کسی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ شکل میں بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی حس جو حیوانات میں مفقود ہے۔ مگر انسانوں کا کوئی گروہ انتہائی وحشت کی حالت میں بھی اس سے خالی نہیں پایا گیا۔

(ب) آدم کا زمانۂ وجود متحقق کرنے کا ابھی تک کوئی ذریعہ نہیں ملا ہے۔ کوئی علم اس معاملہ میں یقینی یا قریب بہ یقین معلومات فراہم نہیں کرتا۔ یہ علم صرف انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ البتہ علمِ تناسل اور قیاساتِ عقلی کی مدد سے دو نظریے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ موجودہ انسانی نسل متعدد انسانی مورثوں کے نطفے سے نکلی ہو۔ یا پھر یہ کہ اس کا ایک ہی مورث ہو اور اس سے حیاتِ انسانی ان بے شمار افراد تک منتقل ہوتی ہو۔ آپ خود دیکھ لیں کہ ان میں سے کونسا نظریہ زیادہ قرینِ عقل ہے۔

---

فصل ۲

# آغازِ انسانیّت کا قرآنی بیان اور نظریۂ ارتقاء

## آغازِ انسانیت کس شکل میں ہوا؟

تخلیق انسانی کے آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ موادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا۔ پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی؟ اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی؟ لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے، جو موجودہ زمانہ کے ڈاروِن کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رُو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل خط میں کوئی نقطہ خاص ایسا نہیں ہو سکتا کہ جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر "نوعِ انسانی" کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت سے ہی ہوا ہے۔ اس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔ وہ اوّل روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا۔ اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

## دو مختلف فلسفے

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطہ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصوّر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصوّر کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین حتّٰی کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے ماتحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرزِ عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل میں اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے۔ وہ

بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آلائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں، انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کی بجائے "انسان" ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ "حیوانِ ناطق" یا "متمدن جانور" (SOCIAL ANIMAL) نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اُسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی، بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویۂ نظر سے یک سر مختلف ہو جائے گی۔ آپ انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفۂ حیات اور ایک دوسرا ہی نظامِ اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے۔ اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالمِ اسفل کے بجائے عالمِ بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔

## کیا نظریۂ ارتقا ثابت شدہ حقیقت ہے؟

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دوسرا تصورِ انسان چاہے اخلاق اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر محض اس تخیل کی خاطر ایک ایسے نظریہ کو کس طرح رد کر دیا جائے جو سائنٹیفک دلائل سے ثابت ہے۔ لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے: کیا فی الواقع ڈارونی نظریۂ ارتقا[1] سائنٹیفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے؟ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے۔ لیکن محققین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سروسامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے۔ اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائلِ ثبوت کہا جاتا ہے، وہ دراصل محض دلائلِ امکان ہیں۔ یعنی ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈارونی ارتقا کا ویسا ہی امکان ہے جیسا براہِ راست عملِ تخلیق سے ایک ایک نوع کے الگ الگ وجود میں آنے کا امکان ہے۔

---

[1] نفسِ ارتقا تو ایک امرِ واقعی ہے جس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ڈارونزم ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور مفروضہ بھی ایسا جو تمام مشہور حقائق کی معقول توجیہ نہیں کرتا، بلکہ بعض حقائق کی قیاسی توجیہ (باقی برصفحۂ آئندہ)

## بحث سے متعلق دو اہم آیات

| | |
|---|---|
| اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ | "جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ |
| خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ | اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے |
| جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ | کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی |
| مَّهِیْنٍ (السجدہ آیات ۔ ۷-۸) | جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔" |

اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد و حساب چیزیں بنائی ہیں، مگر کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو۔ ہر شے اپنا اپنا ایک الگ حسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ متناسب اور موزوں ہے۔ جو چیز جس کام کے لیے بھی اس نے بنائی ہے اس کے لیے موزوں ترین شکل پر، مناسب ترین صفات کے ساتھ بنائی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سننے کے لیے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور تک

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرتے ہوئے بہت سے حقائق سے نظر چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک شدید علمی استبداد جو پادریوں کے مذہبی استبداد سے اپنی متعصبانہ نوعیت میں کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس کی پشت پناہی کرتا ہے اور اس کے خلاف سائنٹیفک تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ تاہم اس نظریے پر اب تک جو تنقیدیں بڑے علمی استدلال کے ساتھ ہوئی ہیں۔ انھیں نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر بکثرت اعتراضات ایسے ہیں جن کو رفع کرنے میں ڈارونزم کے حامی اب تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آپ اس تنقیدی لٹریچر کا مطالعہ کر کے خود دیکھ لیں کہ اعتراضات کتنے وزنی ہیں اور جن چیزوں کو ڈارونزم کا ثبوت کہا جاتا ہے وہ کس قدر کمزور ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک ہی کتاب (THE REVALT AG AINST REASON) کے مطالعہ کا میں آپ کو مشورہ دوں گا۔ میں جس چیز کو صحیح سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ نباتات و حیوانات کی ہر نوع اور اسی طرح نوعِ انسانی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کے پہلے فرد کو وہ براہِ راست اپنے تخلیقی عمل سے وجود میں لایا اور اس کے بعد خود اسی کے اندر اس نے تناسل کی طاقت رکھ دی۔ جس سے بے شمار افراد توالد و تناسل کے ذریعہ سے وجود میں آتے چلے گئے۔ یہ نظریہ تمام مشہود حقائق (OBSERVED FACTS) کی زیادہ بہتر توجیہ کرتا ہے اور کوئی اعتراض اس پر ایسا نہیں لایا جا سکتا جس کا جواب اس نظریہ میں موجود نہ ہو، نہ کوئی مشکل اس نظریے کی تفصیلات میں کسی جگہ ایسی سامنے آتی ہے جو حل نہ ہو سکتی ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہر ممکن التصور مفروضے کو تو قابلِ غور سمجھا جاتا ہے، مگر اس نظریے سے فرار کیوں کیا جاتا ہے۔

نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ہوا ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہئیں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دہی نہیں کر سکتے، نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

اس نے براہِ راست اپنے تخلیقی عمل (DIRECT CREATION) سے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفہ سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور و عقل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آگئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آئندہ مزید انسانوں کی پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب، اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ آیت قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہے جو انسانِ اول کی براہِ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون کے زمانہ سے سائنس دان حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں۔ لیکن انسان کی نہ سہی، تمام انواعِ حیوانی کی نہ سہی، اوّلین جرثومۂ حیات کی براہِ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے، حالانکہ صرف ایک خلیہ (CELL) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اس سے لاکھوں درجہ غیر سائنٹیفک بات ہے جتنا نظریہ ارتقا کے قائلین نظریۂ تخلیق کو ٹھیراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہِ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا، تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے، اور پھر اس کی نسل تناسل (PROCREATION) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے علمبرداروں کی ساری سائنٹیفک شاعری کے باوجود ان کے نظریۂ ارتقا میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔

## فصل ۳

# زندگی کا ظہور اندھا حادثہ نہیں

## ابتدائے خلق اور اعادۂ خلق

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ (النمل۔ آیت ۶۴)

اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔

تخلیق کو دیکھیے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اس وقت تک مسلّم سائنٹیفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادّے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں ان سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (LAW OF CHANCE) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (LABORATORIES) میں بے جان مادّے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادّہ ہے جسے اصطلاح میں (D.N.A) کہا ہے۔ یہ وہ مادّہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ حیات تو ضرور ہے مگر خود جاندار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے۔ زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانیات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے میں اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی

چلی آرہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (DESIGNED) کے سوا زندگی کی اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈاروِن کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ متحجرات (FOSSILS) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ گمشدہ کڑی کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے ہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق البارئ المصوّر ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (MECHANISM) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علمِ تناسل (GENETICS) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (CELL) کے ایک حصے میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقتور خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشو و نما کو ٹھیک اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانہ سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انھوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصور

وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے۔ ہر نوع کے افراد سے پیہم اسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالد و تناسل کے اس خوردبینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لیے ہوئے ہوتا ہے اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پُرپیچ عملیات (PROGRESSES) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخم تناسل اسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتداء کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حی و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی ان کارخانوں کی نگرانی و رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

## تخلیقِ انسانی میں اللہ کی تدبیر

پورے نظامِ کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدائش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے اور ہر ایک کے وجود اور نشوونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے لیکن وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے کہ ایک فردِ انسانی جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اس میں ایک حکیم و قادرِ مطلق ہستی کا ارادہ فیصلہ کُن شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے اس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جا کر کہیں بال، کہیں گوشت اور کہیں ہڈی بنتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تخموں کی کثرت کا حال یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے اس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بیضۂ انثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر یہ کسی حکیم و قدیر اور حاکمِ مطلق کا فیصلہ ہے جو ان بے شمار امیدواروں میں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر چھانٹ کر بیضۂ انثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح استقرارِ حمل رونما

ہوتا ہے۔ پھر استقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے (EGG CELL) کے ملنے سے جو چیز ابتداءً بنتی ہے وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خوردبین کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ حقیر سی چیز ۹ مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پا کر جن بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے ان میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمہارا دل گواہی دے گا کہ یہاں ہر آن ایک حکیم فعّال کا ارادی فیصلہ کام کر رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل کو پہنچاتا ہے اور کسے خون کے لوتھڑے، یا گوشت کی بوٹی، یا ناتمام بچے کی شکل میں ساقط کر دیتا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالتا ہے اور کس کو مردہ، کس کو معمولی انسان کی صورت و ہیئت میں نکالتا ہے اور کسے ان گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دیتا ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالتا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا یا ٹنڈا اور لُنجا بنا کر پھینک دیتا ہے۔ کس کو خوبصورت بناتا ہے اور کسے بدصورت، کس کو مرد بناتا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر بھیجتا ہے اور کسے کُودن اور کُند ذہن پیدا کرتا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل، جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحموں میں ہو رہا ہے، اس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دنیا کی کوئی طاقت ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے۔ حالانکہ انسانی آبادیوں کی قسمت کے کم از کم ۹۰ فی صدی فیصلے انہی مراحل میں ہو جاتے ہیں اور یہیں افراد ہی کے نہیں، قوموں کے، بلکہ نوعِ انسانی کے مستقبل کی شکل بنائی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچے دنیا میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے، اور کس کو قیامت کے بوریے سمیٹنے ہیں؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی کارفرمائی کسی عالمگیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو اس امر میں شک ہے کہ اللہ "حق" ہے اور صرف اللہ ہی حق ہے تو بے شک وہ عقل کا اندھا ہے۔

**مطلب و تراکیب**

| | |
|---|---|
| فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ | پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے |
| مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْ | پیدا کیا گیا ہے ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا |

بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۔ کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے

(الطارق - آیات ۵ تا ۷) درمیان سے نکلتا ہے۔

اس میں صلب اور ترائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اور ترائب کے معنی ہیں سینے کی ہڈیاں یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادۂ تولید انسان کے اس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں جو صلب اور سینے کے درمیان واقع ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادہ اس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضاءِ رئیسہ اس کے ماخذ ہیں اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ صلب دماغ کا وہ حصّہ ہے جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگرچہ جسم کے مختلف حصوں کے افعال (FUNCTIONS) الگ الگ ہیں لیکن کوئی حصّہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ دوسرے اعضاء کے تعامل (CO-ORDINATION) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادۂ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ فوطہ ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادۂ منویہ بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھیے۔ پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے سے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گُردے تک پہنچانے والے اعضاء اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادہ الگ کر کے مثانے میں بھیج سکتا ہے جس کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اسی لیے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈی سے نکلتا ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "ان دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اس سے یہ مادہ خارج ہوتا ہے"۔ یہ اس بات کی نفی نہیں ہے کہ مادۂ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل (MECHANISM) ہے جسے جسم کے کچھ خاص اعضاء انجام دیتے ہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذات نہیں ہے۔ یہ اپنا پورا کام اس پورے نظامِ اعضاء کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صلب اور ترائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ وضاحت

کا ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب یہ نظام کام کرتا رہتا ہے۔ البتہ صلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔

علم الجنین (EMBRYOLOGY) کی رو سے یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جنین (FOETUS) کے اندر انثیین (TESTICLE) یعنی وہ غدود جن سے مادۂ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اتر جاتے ہیں۔ یہ عمل ولادت سے پہلے اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَیْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (ARTERY) پیٹھ کے قریب شہ رگ (AORTA) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت میں انثیین پیٹھ ہی کا جزو ہے جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں مادۂ منویہ اگرچہ انثیین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسۂ منویہ (SEMINAL VESICLES) میں جمع ہوجاتا ہے، مگر اس کے اخراج کا مرکزِ تحریک بَیْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ہی ہوتا ہے اور دماغ سے اعصابی رو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے تب اس مرکز کی تحریک (TRIGER ACTION) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لیے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علم طب کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

## مردہ مادّے سے زندگی کا ظہور

| | |
|---|---|
| يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ | وہ زندہ میں سے مردے کو نکالتا ہے اور مردے |
| الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (الروم۔ آیت 19) | میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے۔ |

وہ ہر وقت زندہ انسانوں اور حیوانات میں سے فضلات (WASTE MATTER) خارج کر رہا ہے جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحہ بے جان مادے (DEAD MATTER) کے اندر زندگی کی روح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے، حالانکہ بجائے خود ان مادوں میں، جن سے ان زندہ ہستیوں کے جسم مرکب ہوتے ہیں، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن یہ منظر ہمیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسر آیا اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی

(باقی برصفحہ ۳۵)

# مغربی تہذیب کا بحران

جناب ریاض الحسن نوری۔ ایم۔اے

(۳)

**شراب کا مشکل مسئلہ** پال بی ہارٹن اور جیرالڈ۔ آر۔ لیس لائی لکھتے ہیں:۔

"جہاں کہیں شراب کا تعلق جوانمردی اور طاقت سے جوڑا جاتا ہو ——جیسا کہ آئرلینڈ، فرانس اور امریکہ میں ہے —— تو ایسی جگہ الکوحل ازم کا پایا جانا ضروری ہے"[1]

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ حضرات لکھتے ہیں کہ دوسرے تمام نشیات سے زیادہ مشکل مسئلہ شراب کا ہے:۔

"الکوحل ہمارے ملک میں تمام نشیات سے زیادہ اُلجھا ہوا مسئلہ ...... ہے۔ حکومت کے بیان کے مطابق ۲ لاکھ ڈالر کثرتِ شراب خواری کے خلاف اشتہارات پر خرچ کیے جائیں گے...... شراب کی کثرت کی مثال دیتے ہوئے مارس نے جو الکوحل ازم کے سرکاری نیشنل انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، فرمایا کہ نیویارک شہر ہی میں کثرتِ شراب خواری (الکوحل ازم) کے ۶ لاکھ مریض ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہیروئن نشہ کے عادی صرف ایک لاکھ پچیس ہزار ہیں۔ ہمارے اکثر لوگوں کے نزدیک ہیروئن کا نشہ غیرملکی اور دُور دراز

(1) Sociolcgy of Social Problems. by Paul B. Horton and Gerald R. Leslie P. 543.

کی چیز معلوم ہوتا ہے اور الکوحل ازم قریبی اور جانی پہچانی چیز معلوم ہوتی ہے۔

پس نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ (۱)

نیو یارک چرس وغیرہ کی قسم کی منشیات کی روک تھام کے لیے الکوحل ازم کی نسبت چالیس گنا رقم مختص کرتا ہے۔

روس میں شراب کی تباہ کاریاں | نیوز ویک مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء صفحات نمبر ۱، ۲، ۷، کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"سوویٹ حکومت پر بڑا بوجھ پڑ رہا ہے۔ اس تناؤ کی وجہ سے یہ حکومت کسی وقت بھی پھٹ سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام دنیا بھی پھٹ سکتی ہے....

سوویٹ یونین بیسویں صدی کی ان چند نیم تجدد زدہ (Semi-Modern) سوسائٹیوں میں سے ہے جہاں شرح اموات بڑھ رہی ہے۔ ماہرین نہیں جانتے کہ کیوں ایسا ہو رہا ہے مگر تمام تنہا دیتیں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس کی وجہ الکوحل ازم ہے

تمام روسی آبادی میں شرح اموات برابر بڑھ رہی ہے۔ حتیٰ کہ بچوں کی شرح اموات میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ یعنی سالانہ دس فیصد سے زیادہ .... ۲۰۰۰ء عیسوی تک سوویٹ یونین کی کل آبادی کا تیسرا حصہ مسلمان ہو جائیں گے۔ عظیم روسیوں کی تعداد نصف سے بھی کم رہ جائے گی۔ وہ پھر سینٹر سے حکومت نہ کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا احسان ہے کہ اُس نے انسانوں کو بتا دیا کہ شراب میں نقصان ہی نقصان ہیں اور اس کو حرام بھی کہہ دیا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن (تم اللہ تعالیٰ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!)۔

یہ صرف شراب ہی کی بات نہیں ہے جس کے متعلق روز بروز نئی نئی تحقیقات سے قرآن کی سچائی نکھر کر سامنے آ رہی ہے بلکہ تمام قرآنی قوانین میں انسانوں کے لیے نعمتیں ہی نعمتیں ہیں۔ فائدے ہی فائدے ہی فائدے ہیں۔ جتنا جلدی لوگ انہیں سمجھ لیں اتنا ہی ان کا فائدہ ہے۔

(1) The Sociology of Social Problems. Page 524, 525

**نسل در نسل بدبختی** کچھ گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کی سزا کرنے والوں ہی کو ملتی ہے مگر جدید تحقیقات سے اس کا ثبوت فراہم ہوا ہے کہ شرابیوں کے بچے اگر ذہین اور نارمل بھی ہوں تو پھر بھی جوانی میں جا کر وہ نفسیاتی مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۷۹ء کے نیوز ویک کے صفحہ ۸۴ پر ایک تحقیقاتی رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان ہے "عادی شرابیوں کی اولاد" (Kids of Alcoholics) ہم اختصار کے ساتھ اس کا بعینہٖ ترجمہ پیش کرتے ہیں:-

"اس کی ماں عادی شرابی (alcoholic) تھی مگر ڈیوڈ ایک ماڈل بچہ دکھائی دیتا تھا۔ سات سال کی عمر میں وہ گھر کی صفائی کرتا۔ کھانا پکاتا۔ کپڑے دھوتا اور اپنے شرارتی چھوٹے بھائی کی نگرانی بھی کرتا۔ ہائی سکول میں وہ اپنی کلاس کا صدر تھا اور کالج میں وہ سب سے اعلیٰ درجے میں آنرز کے ساتھ ڈگری لے کر پاس ہوا۔ پھر قانون کے سکول میں داخلہ لیا۔ محنت کرنے کے بعد اس نے غیر شعوری طور سے محسوس کیا کہ اس کا منتہا بالکل خالی خولی ہے۔ ناامید، غمزدہ اور تنہائی کے احساس اور سمجھ میں نہ آنے والی پریشانی سے مجبور ہو کر اس نے ڈاکٹر سے مدد چاہی۔ ۲۶ سالہ ڈیوڈ یادیں تازہ کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ آخر کار ایک معالج نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی شرابی تھا؟ میں ششدر رہ گیا۔ میں ہمیشہ سے ایک اچھا بچہ اور ایک سمارٹ لڑکا رہا تھا۔ میں اس تعلق کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔

اکثر معالج بھی اس تعلق کو نہیں سوچ سکتے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک محققین جو شرابیوں کے بچوں سے متعلق تھے۔ صرف انہی بچوں پر توجہ مرکوز کرتے تھے جو اچھا رویہ نہ رکھتے تھے۔ انہی کے متعلق یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں وہ بھی بڑے ہو کر شرابی نہ بن جائیں۔ (عادی شرابیوں میں سے ۵۰، ۶۰ فیصد لوگوں کے والدین میں سے کم از کم ایک ضرور عادی شرابی ہوتا ہے)۔

لیکن اب پیشہ ور معالج یہ کہتے ہیں کہ شرابیوں کے بظاہر اچھے بچے بھی خطرے میں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سٹیفنی براؤن جو سٹینفورڈ میڈیکل سنٹر الکوحل کلینک کی ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر

ہیں، فرماتی ہیں کہ اب تک ہم حقیقت سے نا آشنا رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ایسے بچوں کی پوری آبادیاں ہیں کہ جو اتنے اچھے طور سے پروان چڑھتے ہیں کہ بالکل بے عیب معلوم ہوتے ہیں اور اتنا کچھ حاصل کرتے ہیں جو اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت ہوتا ہے پھر جب یہ بیس یا تیس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو سب کچھ گڑبڑ ہونے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ میری تحقیقات یہ بتاتی ہے کہ ان میں سے آدھے سے زیادہ شراب کی طرف لپکتے ہیں اور عادی بن کر نسل در نسل کے لیے اس مصیبت کو ابدی کر دیتے ہیں۔

...... معالجوں کے پاس شرابیوں کی جو بڑی اولاد مدد کے لیے آتی ہے۔ ان کی مختلف مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن دو باتیں خاص طور سے پائی جاتی ہیں اول یہ کہ یہ لوگ اپنے احساسات پر بھروسہ نہیں کر پاتے۔ دوسرے یہ کہ انہیں یہ ڈر رہتا ہے کہ وہ اپنی ذات پر کنٹرول نہیں رکھتے۔ یہ دونوں چیزیں اس ڈیفنس میکینزم (defence mechanism) کا نتیجہ ہوتی ہیں جو ان میں گھر کے گڑبڑ حالات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ پھر بڑے ہونے کے بعد ان پر اُلٹ کر آن پڑتا ہے۔

۲۷ سالہ سوشل ورکر بلیک جو کیلیفورنیا کے ہسپتال میں کام کرتی ہیں وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ آج جو چھ سالہ اڈل لڑکا اپنے دفتر میں دیکھتی ہوں اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ بھی اسی طرح قنوطیت زدہ ناامید جلد شرابی بننے والا ہو جائے گا جیسا کہ میں نے ایک ۵۴ سالہ کو دیکھا تھا......

..... بلیک اور براؤن دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شرابیوں کے بچے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر اور اس ڈر سے کہ ان کے والدین پریشان نہ ہوں، اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ جذبات کو ہر حالت میں ہر قیمت پر دبایا جائے۔

..... بعض اوقات بچہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میری فلاں بات سے خفا ہو کر میرے والد یا والدہ نے شراب پی ہے۔ اگر میں فلاں بات نہ کرتا تو والد یا والدہ شراب نہ پیتے اور اس طرح سے بچہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا ہے......

سب سے مشکل سبق یہ سیکھنا ہے کہ شرابی کے بچے کو چاہیے کہ اپنے والد یا والدہ

کو بھلا کر خود اپنی فکر کرے اور اپنے ذہن کو صحت مند رکھنے کی کوشش کرے"۔

تفصیلات کے لیے ناظرین کو ہم اصل مضمون پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ شراب نہ صرف شرابی کو خراب کرتی ہے بلکہ اس کی نسلوں کو بھی بدبخت بنا دیتی ہے۔ اللہ کا کتنا فضل ہے اور اس کی رحمت کیسی ذرہ نواز ہے کہ اُس نے انسانوں پر اس کو حرام کر دیا ہے تاکہ وہ ان تمام بُرے اثرات سے محفوظ رہیں فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔

ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں چوتھی بار شرابی کو حد لگانے کے سلسلے کا ذکر ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس حدیث کو سنیوں نے یہ کہہ کر قانون سازی سے خارج کر دیا ہے کہ یہ سنتِ ثابتہ نہیں ہے۔ مگر فقہ جعفریہ کے مطابق فتویٰ اس بات پر ہے کہ اگر شرابی چوتھی بار بلکہ بعض کے مطابق تیسری بار حد لگانے کے لیے لایا جائے تو اُسے قتل کی سزا دی جائے۔

بیروت سے ۱۹۶۶ء میں شیعوں کے مشہور عالمِ دین محمد جواد مغنیہ کی کتاب موسومہ "فقہ الامام جعفر الصادق" چھ حصوں میں چھپی ہے۔ اس میں یوں درج ہے۔

اذا ثبت الشرب بحد الشارب ثمانين جلدة اجماعًا ونصًا..... واذا أقيم عليه الحد ثلاث مرات قُتِل في الرابعة وقيل: في الثالثة [1]

مذکورہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بہر حال عادی شرابی کو قتل نہ بھی کیا جائے تو کم از کم اس کو شادی کرنے یا اولاد پیدا کرنے سے روک دینا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں بربادی سے محفوظ ہو جائیں۔

**ٹیکس اور مغربی حکومتیں** دراصل جدید دور کی مغربی حکومتیں کو عوام کی حقیقی فلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں پادری حضرات عوام سے کہا کرتے تھے کہ گناہ کر کے ہمارے پاس آؤ اور اتنی رقم ہمیں دے دو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

پھر کہنے لگے کہ اتنی رقم ہمیں دے دو تو پھر اگر تم فلاں فلاں گناہ کرو گے بھی تو وہ معاف ہوگا۔

---

[1] فقہ الامام جعفر الصادق - مؤلفہ محمد جواد مغنیہ - ص ۳۹۲ جلد ۶ -

انہیں کی دیکھا دیکھی یورپ کے حکمران بھی عوام پر ٹیکس عاید کرنے لگے۔ سب سے پہلی بار یورپ کے بادشاہوں نے عوام پر بلاواسطہ ٹیکس تیرھویں صدی میں عاید کیے۔ تفصیل کے لیے امریکی مورخ کا بیان ملاحظہ ہو۔ اصل تفصیلات متعلقہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں[1]

**گوناگوں نقصانات** امریکہ میں سب سے زیادہ گرفتار وہ لوگ ہوتے ہیں جو شراب میں دھت پائے جاتے ہیں۔ ناروے جیسے فلاحی اور سوشلسٹ ملک میں ۱۹۶۲ء میں جیل کی سزا پانے والوں میں سے ۴۶٫۵ فیصد ان لوگوں کی تعداد تھی جو شراب پی کر کار چلا رہے تھے۔[2]

ویسٹرن میشیگن یونیورسٹی کے ہارٹن اور فلوریڈا یونیورسٹی کے لیسلائی (Leslie) لکھتے ہیں:

"امریکہ کے دوتہائی بالغ شراب استعمال کرتے ہیں جن میں سے ۹۰ لاکھ مریض ہونے کی حد تک شرابی یعنی Alcoholics ہیں۔ شراب پر امریکہ میں الکوحلکس کی وجہ سے اقتصادی نقصانات ہر سال ۱۵ بلین ڈالر (۱٬۵۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ روپیہ) ہوتا ہے۔ شراب کی وجہ سے ہر سال ۸۵٬۰۰۰ اموات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو شراب کی وجہ سے گھر اجڑتے ہیں۔ ملازمتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جسمانی اور دماغی امراض پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

شراب کے علاوہ دیگر منشیات (مثلاً کوکین، حشیش وغیرہ) کے عادی امریکہ میں ۶ لاکھ پائے جاتے ہیں۔ جو اپنی اس عادت پر ۵ ابلین ڈالر یعنی ایک کھرب پچاس ارب روپے خرچ کرتے ہیں۔ صرف نیویارک سٹی میں شراب کے علاوہ دیگر منشیات سے تقریباً ایک ہزار افراد ہر سال لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ خودکشی کی طرف زیادہ آسانی سے مائل ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ان منشیات کا رواج زیادہ ہو گیا تھا۔ اور اس وجہ سے

1- P. 187-''Civilization in the West.
by Crane Brinton Professor of Ancient and Modern History,
Harvard University and T.B. Cristopher of Rocester University and
Robert Lee of Harverd

2- Page 246, Contemporary Social Problems by Merton and Nisbet

حالت زیادہ دگرگوں ہو گئی۔ ایک کروڑ پچاس لاکھ امریکنوں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور ۸۰ لاکھ سے زیادہ امریکن آجکل ان منشیات کو استعمال کر رہے ہیں..... امریکہ میں دماغی امراض کی وجہ سے بھاری اقتصادی نقصان ہو رہا ہے۔ ان امراض کے علاج پر اور اس سے جو صنعت کو نقصان پہنچتا ہے وہ کم از کم تقریباً ۲۰ بلین ڈالر (یعنی دو کھرب روپے) کا ہوتا ہے۔ آجکل تقریباً ۳۰ لاکھ امریکی دماغی امراض کی وجہ سے ہسپتالوں کے باہر اپنا علاج کروا رہے ہیں۔ شماریات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰ تا ۴۰ فیصد امریکن دماغی امراض میں مبتلا ہیں"[1]

دماغی امراض کے اعداد و شمار کی اُلجھن یہ ہے کہ ماہرین اس امر پر اختلاف کرتے ہیں کہ کن حالات میں کسی کو مکمل دماغی مریض کہا جا سکتا ہے اور کن صورتوں میں نیم مریض۔ ان اعداد و شمار کو یوں سمجھ لیجیے کہ ۱۰ فیصد تو بالکل پاگل ہوتے ہیں اور باقی ۳۰ فیصد ایسے نیم پاگل جو ذہنی توازن کھو چکے ہوں۔

**دماغی امراض کی بحث** جہاں تک دماغی امراض کی وجوہات کا تعلق ہے تو جو کچھ مذکورہ بالا مصنفین اور دیگر ماہرین نے لکھا ہے اُس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دماغی امراض کی بڑی وجہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ سوشل حالات ہیں۔ مذکورہ بالا مصنفین سب سے پہلے دماغی امراض کی وجوہات کو ناقابلِ حل معمّا قرار دیتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ عرصہ سے ڈاکٹر اور حیاتیاتی سائنس دان ایسی بنیاد تلاش کرنے کی فکر میں ہے ہیں جس کی بنا پر دماغی امراض کو بیماری کہا جا سکے (یعنی اُسے بیماری کہنے ہی میں مشکلات پیش آجاتی ہیں)۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"اگر بالفرض چند محدود اقسام کی دماغی تکلیفوں کو توارثی یا کیمیاوی بنیاد دے بھی دی جائے تو پھر بھی اکثر تکالیف بلا توجیہ کے رہ جائیں گی۔ حیاتیاتی سائنس دان بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دماغی امراض میں سوشل حالات کا بہت بڑا حصہ ہے ...... ایک نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ ذہنی بے توازنی کا شکار ہوتے ہیں وہ عام طور پر شہروں کے اندرونی حصوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جہاں کہ سوشل بدنظمی موجود ہوتی ہے.... دوسرا

---

[1] دی سوشیالوجی آف سوشل پرابلمز۔ ص ۵۷۵، ۵۷۶۔

نظریہ یہ ہے کہ شہروں کے اندرونی حصوں میں حالات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے دماغی امراض کی وہاں زیادہ کثرت ہو جاتی ہے۔"[1]

مذکورہ بالا بیانات اور ماہرین کے دیگر بیانات سے جن سب کو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں، یہ بات بہر حال واضح ہو جاتی ہے کہ دماغی امراض کی کثرت کی وجہ جدید تہذیب اور اس کے پیدا کردہ حالات ہیں۔ اس سلسلے میں جو اقتصادی نقصانات ہو رہے ہیں وہ بھی سن لیجیے۔

مذکورہ بالا مصنفین لکھتے ہیں کہ:۔

"دماغی امراض کی کثرت کے پیدا کردہ کل اقتصادی نقصانات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اور شاید لگایا بھی نہیں جا سکتا۔ مگر شاید نیشنل انسٹیٹیوٹ آف نیشنل ہیلتھ کے دماغی امراض کے بلوں سے ان کے علاج پر خرچ ہونے والی رقم اور پروڈکشن کے نقصانات کا جو حساب لگایا گیا ہے اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ حساب ۲۰ بلین ڈالر (یعنی ۲ کھرب روپے) کا لگایا گیا ہے۔ اس نقصان کا اندازہ لگانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ مثلاً ہسپتالوں میں دواؤں اور مریضوں کے اخراجات کا حساب لگایا جائے۔ پھر ان کا حساب لگایا جائے جو ہسپتالوں سے باہر پرائیویٹ طریقوں سے علاج کراتے ہیں۔ پھر اس کا حساب لگایا جائے کہ کل آبادی میں کتنی تعداد ایسی ہے جن کا دماغی توازن درست نہیں۔"[2]

(باقی)

---

(1) Science News, 102 (July 22, 1972) 58-59.

(2) P. 533. 534 The Sociology of Social Problems

# قائداعظم، جسٹس منیر اور سیکولرازم

## مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفورؒ

شنید ہے کہ جسٹس منیر صاحب کی کتاب فرام جناح ٹو ضیا پر پابندی لگ گئی ہے یا لگنے والی ہے۔ میں اس کوشش میں تھا کہ سَو روپے قیمت کی اس مختصر سی کتاب کو کسی طرح حاصل کر کے پڑھوں، اور اس پر کچھ لکھوں۔ مگر اب اس کا موقع نہیں رہا۔ تاہم مجھے اندازہ ہے کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہوگا۔ جسٹس منیر سرزمین پاکستان میں سیکولرازم کے سرپرستِ اعظم ہیں۔ حال ہی میں نفاذِ اسلام کے سلسلے میں انتخابی اور غیرانتخابی طرزِ سیاست پر فکری الجھنوں کا جو غبار اٹھا ہے غالباً اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے جسٹس صاحب نے ایک بار پھر سیکولرازم کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے تصور کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا نام "جسٹس منیر سے جسٹس منیر تک" ہونا چاہیئے۔ یا "منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک" یعنی وہ ایک ہی خیالات ہیں جو اضطراباتِ پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کی کارروائیوں سے لے کر بعد کے اخباری مضامین اور حالیہ کتاب تک دوہرائے گئے ہیں۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ جسٹس منیر قائداعظم جیسی ہستی کو کھینچ کر جب اپنے ساتھ کھڑا کرنے کی سعیٔ بے جا کرتے ہیں تو وہ ایک ملک کے موسس اور ایک قوم کے بلند مرتبہ لیڈر کی توہین کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ تحقیقاتی عدالت میں جب پہلے پہل انہوں نے قائداعظم کے ساتھ یہ زیادتی روا رکھی تو اس کا مختصر مگر مدلل ناقدانہ جواب مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ایک عدالتی بیان ہی میں دیا۔ ان دنوں جب کہ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔ مولینا کی اس تاریخی تحریر کو پیش کیا جاتا ہے۔

یوں تو جسٹس منیر صاحب نے متعدد ضمنی بحثیں اور بھی چھیڑی ہیں جو سیکولرازم ہی کے شاخسانے ہیں۔ سیکولرازم دراصل ہے ہی اباحت کے دروازے کھولنے کا ذریعہ۔ سو اس زاویۂ نظر کے ساتھ جب کوئی شخص اظہار خیال کرے گا تو قدرتی طور پر کئی سوال پیدا ہوں۔ مگر اس کا موقع نہیں کہ تفصیلی بحثیں اس موقع پر چھیڑی جائیں۔ یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور کی تحریر کے ساتھ کسی اور چیز کا پیوند لگایا جائے۔ (ن ۔ ص)

میں اس غلط فہمی کو صاف کر دینا چاہتا ہوں جو قائداعظم مرحوم کی اس تقریر سے پیدا ہوئی ہے۔ جو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی مجلس دستورساز میں کی تھی:

میرے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(الف) ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے اور انہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہوں گے جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی۔ نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیام پاکستان کے پہلے ہی دن ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہوں گے جو انہوں نے بارہا صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کئے تھے اور جن کے ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔ پھر ہمارے لئے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائداعظم ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ ۱۱ اگست کو ایک اعلان کریں اور پھر اس کے بعد بار بار اس کے بالکل خلاف باتوں کا مسلمان پبلک کو یقین دلاتے رہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان کی مذکورہ بالا تقریر کو ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انہوں نے اس سے پہلے فرمائیں اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

(ب) سب کو معلوم ہے کہ قائداعظم کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر۔ ۱۱ اگست ۴۷ء تک۔ ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک

تحریر کا اقتباس میں یہاں نقل کروں گا جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی یاد۔

"ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں جو "قوم" کی ہر تعریف اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ مزید براں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ اور فن تعمیر، احساس اقدار و تناسب، قانونی احکام و اخلاقی ضوابط، رسم و رواج اور تقویم (کیلنڈر) تاریخ اور روایات، رجحانات اور عزائم کی مالک ہے۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک امتیازی زاویۂ نگاہ ہے اور قانون بین الاقوامی کی ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں"۔

(مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں مرتبہ جمیل الدین احمد ص ۱۸۱ و ۱۸۲)

اب کیا ہم یہ باور کرلیں کہ ۱۱ اگست کو یکایک وہ تمام خصوصیتیں مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھیں اور یکایک ایک نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائد اعظم مرحوم کو اس الزام سے نہیں بچایا جاسکتا کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے۔ بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بنانے اور بدلتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لئے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

ج:۔ بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قائد اعظم مرحوم مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کا وعدہ کرتے رہے تھے اور اس کے بعد بھی وہ اس وعدے کو دہراتے رہے۔ پہلے کے وعدوں میں سے صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات اپنے تہذیبی ارتقاء اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۴۳۷)

---

لہ۔ قائد اعظم مرحوم اور خان لیاقت علی خان مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات عدالت میں پیش کردہ بیان انگریزی میں تھے۔ یہاں اشاعت کی سہولت کے لئے ان کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

پھر اسی کانفرنس میں انہوں نے ۲۴ نومبر کو تقریر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار فرمایا۔

"ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لئے متحرک کرتے ہیں۔" (حوالۂ مذکور صفحہ ۴۲۲)

پھر اسی زمانہ میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔" (حوالہ مذکور صفحہ ۴۴۶)

۱۱۔ اگست والی تقریر سے صرف ایک مہینہ بارہ دن پہلے ۲۹، ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو مرحوم نے سرحد کے حالات پر ایک بیان دیتے ہوئے لکھا:۔

"مگر خان برادران نے اپنے بیانات میں اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کیا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کریگی۔ یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔" (ڈان ۳۰ جون ۱۹۴۷ء)

دوسری طرف ۱۱۔ اگست ۴۷ء کے بعد جو ارشادات قائد اعظم کی زبان سے سنے گئے اور ان کے معتمر ترین رفیقوں نے ان کی جو ترجمانی بار بار خود ان کی زندگی میں کی اور جس کی کوئی تردید ان کی جانب سے نہ ہوئی اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"پشاور ۱۴ جنوری۔ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے اتحاد و یک جہتی کے لئے سرحد کے لوگوں سے اپیل کرتے ہوئے قائد اعظم کے ان اعلانات کا پھر اعادہ کیا کہ پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہوگا۔۔۔۔۔ انہوں نے فرمایا کہ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگا اور ہم دنیا کو دکھائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول ابھی تک کارآمد ہیں۔" (پاکستان ٹائمز ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

"کراچی ۲۶ جنوری قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے ایک اعزازی دعوت میں جو انہیں کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے گزشتہ شام دی گئی، تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرے لئے وہ گروہ بالکل ناقابل فہم ہے جو خواہ مخواہ شرارت پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ پراپیگنڈہ کر رہا ہے کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنا پر نہیں بنے گا۔" (پاکستان ٹائمز، ۲۷ جنوری ۱۹۴۸ء)

"راولپنڈی ۵ اپریل۔ مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے آج راولپنڈی میں اعلان کیا

کہ پاکستان کا آئندہ دستور قرآن مجید کے احکام پر مبنی ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ قائداعظم اور ان کے رفقاء کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کا نشوونما ایک ایسی مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو جو اپنے باشندوں کو عدل و انصاف کی ضمانت دے سکے۔" (پاکستان ٹائمز، ۔ اپریل ۱۹۴۸ء)

ان صاف اور صریح بیانات کی موجودگی میں قائداعظم کی ۱۱۔ اگست والی تقریر کا ایک ایسا مفہوم نکالنا جو ان کے تمام اگلے پچھلے ارشادات کے خلاف ہو مرحوم کی یاد کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

---

(بقیہ تذکرۂ انبیاء)

زندگی کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مر جانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں۔ (باقی)

---

# مطبوعات

ماۃ فتاویٰ فی مسئلہ علم غیب
مؤلفہ: الحاج چوہدری محمد سرفراز خاں
قیمت: درج نہیں
پتہ: مؤلف مقیم کالرہ کلاں ضلع گجرات

اس کتاب میں جس مبحث پر گفتگو کی گئی ہے، وہ ایسے انتہا پسندانہ علامتی ( [illegible] ) مباحث میں سے ایک ہے جیسے ایک گروہ منوانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا اس کے ابطال کی۔ دراصل یہ استدلال کی ایک جنگی کارروائی ہے مگر بے نتیجہ اس لیے کہ ہر فرقے کے لوگوں نے اپنے گرد تعصب کے مسالے سے خاص خاص تعبیراتِ مسائل کی مضبوط فصیلیں کھڑی کر رکھی ہیں حصار سے باہر کے لوگوں کی آواز اوّل تو اندر پہنچتی ہی نہیں۔ اگر پہنچے تو خطرے کا الارم اور جنگ کا بگل بج جاتا ہے کاش کہ لوگ جنگی ہتھیار پھینک کر ایک ملت کے افراد کی حیثیت سے بھائی بھائی بن کے بیٹھیں اور آپس میں پیار سے افہام و تفہیم کریں، اور پھر بھی اگر اختلاف رہے تو یہ جنگی اختلاف نہ ہو۔

دوسری اہم بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندیٔ رتبہ اور عظمتِ شان کے لیے جو لوگ بڑی بڑی کاوشیں کرتے رہتے ہیں، اُن کی توجہ اس اہم خدمت سے ہٹ جاتی ہے کہ لوگوں کو اصل تعلیم اطاعتِ رسولؐ کی دینی ہے۔ اصل محبِ رسول وہ ہے اور شانِ رسالت کا قدر شناس وہ ہے جو دین کی اطاعت اور دین کے غلبے کے لیے ویسی ہی سعی کرے جیسی رسولِ برحق نے کی۔ اس کوتاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ عظمتِ رسالت پر ہزار وعظوں اور میلادوں کے باوجود قوم میں تشدد، خیانت اور بے حیائی کے روگ اس تیزی سے پھیل رہے ہیں جیسے کوئی طاعون یا فلو کی کوئی وبا ہو، اور رسالت کی بلندیٔ مرتبہ میں نت نئے اضافے کرنے والے حضرات کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ حضورؐ کے اخلاق اور حضورؐ کے کردار کی پیروی کی اپیل کریں۔ لوگوں سے کہیں کہ جھوٹ، چوری، خیانت، قتل، اسمگلنگ، فساد، زنا، شراب، قماربازی، عریانی، جیسی گندگیوں سے بچو!

اور انہی چیزوں سے روکنے کے لیے حضورؐ کی بعثت ہوئی تھی۔ وہ اخلاقِ رسالت اور کردارِ رسالت سے بیگانہ اور باغی لوگوں کو متنبہ کر دیں کہ تم ان خرابیوں کے ساتھ ہمارے فرقے یا ہماری مریدی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یا پھر وہ دُنیا کو دکھائیں کہ اُن کے جن لوگوں نے رسولؐ کے وسیع عطائی علم غیب کو مان لیا ہے، ان کے اخلاق، اُن کے کردار، اُن کے معاملات بہترین معیار کے ہیں کیونکہ اُن کا ایمان اُونچا ہے۔

سوال یہ ہے کہ رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ غیب ہونے یا نہ ہونے یا کم یا زیادہ ہونے سے ہماری اصلاح و فلاح میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ ہماری اصلاح و فلاح میں فرق اس شعور سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضورؐ اخلاق سنوارنے آئے تھے۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

یہ تمہیدی باتیں ایک مختصر تبصرے میں اگرچہ بے محل اضافہ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر میں جناب مؤلف پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ اصل خرابی کیا اور کہاں ہے ـــ اور ضمناً قارئین پر بھی!

اب لیجیے اصل مسئلہ کو ـــ اور کسی دوسرے سے بحث کرنے کے بجائے کوئی بھی مسلمان قرآن شریف کو کھول کر ان آیات کا سادہ ترجمہ پڑھ لے۔

وَعِنْدَهٗ مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو (الانعام - ۷۳) انما الغیب لله (یونس - ۲۰) ولله غیب السمٰوٰت والارض (هود - ۱۲۳) له غیب السمٰوٰت والارض (الکهف - ۲۶) قل لا یعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب الا الله (النمل - ۶۵)

صاحب خزائن غیب صرف اللہ ہے اور سورۂ جن کی آیت ۲۶، ۲۷ کی رُو سے وہ اپنے پسندیدہ رسولوں کو غیب کی جو کچھ باتیں بتانا چاہتا ہے وہ بتاتا ہے۔

رسولوں کو جو غیب بتایا جاتا ہے اس کا وہ حصہ جس سے ہمارا تعلق ہے وہ تو الہامی تعلیم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ قرآن میں ہے اور کچھ باتیں حدیث میں آگئی ہیں۔ اب اگر اس کے علاوہ کوئی سرمایۂ علم غیب مانا جائے تو وہ "بلغ ما انزل الیک" کے دائرے سے خارج ہوگا۔ اس دائرے سے اگر خارج ہے تو اس سے ہمارا واسطہ کیا ہے؟ اور جس سے ہمارا واسطہ ہے اس کا حق ادا کرنے کے لیے ہم کیا کرتے ہیں؟ اگر یہ حق ادا کرنے سے ہم فارغ ہو گئے ہیں تو فرصت

کی گھڑیاں گزارنے کے لیے دوسرے دائرے کا کھوج لگاتے رہے۔ مگر جس طرح الہامی علم کے قطعی دلائل و شواہد ہیں۔ ایسے دلائل و شواہد کیا ادھر بھی ہیں؟ نہیں ہیں تو نکتہ آفرینی کا سلسلہ تو ایسا ہے کہ انسانوں نے پتھروں کے دیوتاؤں کو بھی تقدیر سازِ انسان ثابت کر دیا۔

جس شخص کو رسول بنایا جاتا ہے کیا اس کو رسالت دیتے ہی پہلے دن سے غیب السموٰت والارض کے خزانوں کی کنجیاں سونپ دی جاتی ہیں۔ ایسا ہے تو فرشتۂ وحی کے بار بار آنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب تو رسول کو معلوم ہو گیا کہ آگے کب کونسی آیات اترنے والی ہیں۔

کہتے ہیں کہ علم غیب رسولوں کا اپنا نہیں ہوتا، عطائی ہوتا ہے، یعنی خدا کا عطا کردہ۔ سوال یہ ہے کہ دین و شریعت کا علم دینے کی ضرورت بھی واضح ہے۔ اقوام ماضیہ کے عبرت انگیز احوال کو بھی غیب کے پردے سے نکال کر سامنے لانے کا مقصد ہے، اور مستقبل کے بارے میں انبیا جو پیش گوئیاں خدائی علمِ غیب کی مدد سے کرتے ہیں۔ وہ بھی وجہ جواز رکھتی ہیں۔ لیکن کلی علمِ غیب کی ضرورت، رسولوں کو کیا ہے، مثلاً انھیں یہ بتانا کہ دنیا بھر میں کتنے ذرہ ہائے خاک اور قطرہ ہائے آب پائے جاتے ہیں اور کس لمحے وہ کہاں کس حالت میں ہوں گے، یا دنیا کے ہر پرندے پر کیا گزرے گی، یا صدیوں میں ارب در ارب چیونٹیوں اور دیمکوں یا چھپکلیوں اور ٹڈیوں کے لمحہ بہ لمحہ کیا احوال ہوں گے۔ ہر پتہ کس شاخ پہ نمودار ہو گا، کب ٹوٹ گرے گا، اور ہوائیں اسے اڑا کر کہاں کہاں لے جائیں گی اور آخر میں اس کا انجام کیا ہو گا۔ کیا اس طرح کے سارے علمِ غیب کو رسولوں کے سپرد کرنے کے معنی تکلیف مالایطاق کے نہیں ہیں کہ وہ ایک ایسا بوجھ اٹھائیں جس کا سرے سے کوئی استعمال ہی نہیں کرنا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انبیا کو تمام ٹکنیکل علوم سے آراستہ کیا جائے۔ انھیں سبزیاں کاشت کرنے اور چینی کا کارخانہ چلانے یا اخبار چھاپنے کی تربیت بھی علمِ غیب کے ذریعے دی جائے۔

دین سیدھا سادا دین ہے۔ پہلی بات یہ کہ ایک خدا ہے اور اس کی یہ یہ صفات ہیں، اس کی دی ہوئی ہدایت اور اس کے اوامر و نواہی کے مطابق عمل پیرا ہونا ہے۔ دوسری یہ کہ خدا کا رسول ہے جس کے ذریعے خدا کی ہدایت اور اس کی مرضی کا علم ہوتا ہے۔ خدا کے اوامر و نواہی کا پتہ چلتا ہے، اور رسول نمونے کی عملی زندگی گزار کر دکھاتا ہے کہ خدا کو اس طرح کا جینا پسند ہے۔ خدا، خدا ہے، رسول نہیں ہے، اور رسول، رسول ہے، خدا نہیں ہے۔ نہ اُدھر کا مرتبہ اِدھر، نہ اِدھر کا مرتبہ اُدھر۔

نہ اُدھر کی صفات اِدھر، نہ اِدھر کی صفات اُدھر۔

اصل معاملہ تو یہ ہے کہ اس دین کی پیروی ہم کس درجے کی کرتے ہیں اور اس کو ایک غالب نظامِ زندگی کی حیثیت دینے کے لیے کیا جدوجہد کرتے ہیں، رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے کس طرح ہم لڑتے ہیں، قربانیاں کیا دیتے ہیں۔

خدا اپنی جو شان رکھتا ہے، اور رسولؐ اپنا جو مرتبہ رکھتا ہے، دونوں کی طرف سے یہ مطالبہ بڑے زور سے ہے کہ ملّت کی وحدت کو برقرار رکھو، فرقہ سازیوں سے بچو، اختلافات پر لڑنے کا طریقہ ختم کر دو، تعصبات کے قلعوں میں بند رہنے کے بجائے دلائل و بینات سے مسائل کی باہم افہام و تفہیم کرو۔ رسول اللہ کے نامعلوم علم غیب کے نہ ماننے سے اُن لوگوں کا جرم زیادہ سخت ہے جنہوں نے نہ ماننے والوں کے خلاف نفرت و عداوت کے محاذ کھڑے کر دیے۔ رسولؐ نے ایک ملّت بنائی تھی، آپ نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ فرقے بنا دیے ہیں۔

مؤلف سے معذرت کرتا ہوں کہ اُن کی کتاب پر گفتگو کرنے کے بجائے میں اپنے تمہیدی نکات میں دور تک نکل گیا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ چوہدری محمد سرفراز خاں صاحب نے کتاب و سنت سے اچھی طرح استفادہ کیا ہے۔ اُن کا اندازِ تحریر اس طرح کا جنگی نہیں ہے جیسا ماہرینِ افتراق کا ہوتا ہے۔ اُن کی کتاب پڑھنے سے مسئلہ علم غیب پر ایک متوسط قاری کو بنیادی معلومات بھی مل جاتی ہیں اور بات بھی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مگر کوئی معقول گفتگو اور تحقیقی کتاب بھی واعظوں کی ساحرانہ تقریروں کا جواب نہیں ہو سکتی ——— جن میں سے ایک نے درس دیتے ہوئے کہا کہ یہ جو آیت ہے (قد نری تقلب وجهك فى السماء) اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ میرے حبیب بار بار چہرہ اُوپر اُٹھائیں اور بار بار زیارت کا موقع ملے۔ ورنہ کام تو ایک ہی دفعہ میں ہو سکتا تھا۔

علمِ غیب پر مبنی یہ تفسیر میں نے خود سُنی۔

تاہم چوہدری محمد سرفراز خاں نے جو کام کیا وہ ایک نیک کوشش ہے، انہوں نے علمِ غیب کی گفتگو چھیڑ کر علمِ دین پھیلانے کی راہ نکالی۔

---

(بقیہ اشارات) اُکُلَس یا اَلقُلَّس یا اَلقُلَّیس لکھا ہے۔ رومی حکومت نے حکومت حبش کو یمن پر حملہ کرکے قابض ہونے کے لئے جس مقصد سے مدد دی تھی۔ وہ یہ تھا کہ مکہ کے بیت اللہ شریف کو (نعوذ باللہ) ڈھا دیا جائے۔ ابرہہ نے اس مقصد سے مکہ پر چڑھائی کرنے کا اعلان عام کر دیا۔ کسی عرب نے اعلان سے مشتعل ہو کر صنعاء کے کلیسا میں رفع حاجت کر ڈالی۔ ایک تاریخی روایت یہ بھی ہے کہ بعض عرب نوجوانوں نے مشتعل ہو کر کلیسا میں آگ لگا دی۔ مکے پر چڑھائی کا اعلان عربوں کے لئے اتنا اشتعال انگیز تھا کہ ایسی کوئی بھی حرکت ہونا بعید نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خود ابرہہ ہی نے ایسی ڈرامائی حرکات کرا دی ہوں جو کعبہ کے خلاف عیسائیوں میں حملہ کرنے کے جذبات ابھارنے کا سبب بن سکیں چنانچہ ابرہہ نے قسم کھا کر اعلان کیا کہ کلیسا کی توہین کا بدلہ لینے کے لئے اب میں ضرور کعبہ کو ڈھاؤں گا۔

یہ بدبخت سنہ ۵۷۰ء یا سنہ ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ یا ۹ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا، اس کے بعد جو ہوا وہ ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر سورۂ فیل میں ہے۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا۔ اسی سال حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ محرم میں ہوا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی۔ اکثریت کی رائے میں حضورؐ کی ولادت اصحاب فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

توہین حرم کا دوسرا واقعہ زمانۂ ہدنہ میں پیش آیا۔

سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام میں مسلم جماعت اور قریش کے درمیان معاہدے کی جو شرائط حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سہیل بن عمرو کے دستخطوں سے طے ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جو گروہ یا قبائل حضورؐ کا ساتھ دینا چاہیں یا جو قریش سے رابطہ رکھنا چاہیں۔ دونوں کو آزادی ہوگی اور ان کو امان حاصل رہے گی۔

مگر معاہدہ کو ابھی دو برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ قریش کے ایک حلیف بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے بنو بکر کو اسلحہ کی امداد دی۔ چند قریشی سردار عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو (جس نے معاہدہ پر دستخط کئے تھے) اور صفوان بن امیہ نقاب پوش ہو کر اپنے حوالی موالی کے ساتھ اس کارروائی میں شریک ہوئے۔

پایانِ مکہ کی جانب ایک چشمہ وتیر نامی تھا۔ اس کے پاس بنو خزاعہ آباد تھے۔ حملہ آوروں نے وہاں پہنچ کر رات کو حملہ کیا جبکہ قبیلے کے لوگ سو رہے تھے۔ انہوں نے معاہدے کا حوالہ دیا۔ امان مانگی مگر سب بے کار، بہتوں کو رکوع و سجدہ کی حالت ہی میں قتل کر دیا گیا۔ بچی کھچی تعداد نے بھاگ کر خانہ کعبہ میں پناہ لی۔ مگر وہاں بھی حملہ آور ٹوٹ پڑے۔ مظلوم خزاعیوں نے جب حرم کی حرمت کا واسطہ دلایا۔ اور حملہ آوروں کو اپنے خداوندوں کا خیال کرنے کی اپیل کی تو جواب ملا کہ آج کے دن کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس حملے سے جو چالیس افراد بچ نکلے۔ وہ وفد کی صورت میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ وہاں جاکر داستان سنائی۔ عمرو بن سالم الخزاعی نے شاعری کی زبان میں فریاد کی۔ ترجمہ:۔

قریش نے آپ سے وعدہ خلافی کی۔

انہوں نے اس مضبوط معاہدے کو، جو آپ سے کیا تھا توڑ ڈالا۔

وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری امداد کو کوئی نہیں آئے گا۔

وہ تو ذلیل ہیں اور قلیل ہیں۔

انہوں نے وتیر میں ہم کو سوتے ہوئے جالیا۔

ہم کو رکوع و سجود کی حالت میں کاٹ ڈالا۔

کیا دردناک مصرعہ ہے، فقتلونا رُکَّعًا وَسُجَّدًا۔

اب سنیے حضورؐ کا مختصر جواب: نُصِرْتَ یَا عَمْرو بن سالم یعنی اے عمرو بن سالم جاؤ تمہیں مدد پہنچے گی۔[1]

۸ھ میں فتح مکہ کی مہم سر ہو گئی اور عمرو بن سالم کے دشمن اسلام کے آگے مفتوح ہو گئے۔

توہین حرم کا متذکرہ واقعہ کے بعد پھر حضورؐ نے بیت اللہ اور حرم مکہ کی حرمت کو نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا۔

اب ذرا خود مسلمانوں کی طرف سے توہینِ حرم کے اقدامات ملاحظہ ہوں۔

---

[1] ۔ ان تفصیلات کے لئے میرے سامنے سیرۃ ابن ہشام ج ۴ اور رحمۃ للعلمین ج ۱ ہیں۔

امیر معاویہ نے عمر کے ۸۰ ویں سال میں موت کی گھڑی قریب آنے پر یزید کے نام وصیت نامہ لکھوایا جو اس موقع پر دمشق میں موجود نہ تھا۔ طبری اور الفخری سے اس وصیت کو شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنفین کی شائع کردہ تاریخ اسلام کی جلد دوم میں ص ۲۵ پر درج کیا ہے، اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"جان پدر! میں نے تمہاری راہ کے تمام کانٹے ہٹا کر تمہارے لئے راستہ صاف کر دیا ہے ...... سب سے اہم معاملہ خلافت کا ہے۔ اس میں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور عبداللہ بن زبیر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بغیر کوئی حریف نہیں ہے ......... عبداللہ بن عمر سے کوئی خطرہ نہیں ......... عبدالرحمن بن ابی بکر میں کوئی ذاتی حوصلہ و ہمت نہیں ....... البتہ حسین ابن علی کی جانب سے خطرہ ہے ........ جب وہ تمہارے مقابلہ میں آئیں اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو جائے تو درگذر سے کام لینا ...... البتہ جو شخص لومڑی کی طرح کا دے دے کر شیر کی طرح حملہ کرے گا وہ عبداللہ ابن زبیر ہیں اگر وہ صلح کر لیں تو فبہا، ورنہ قابو پانے کے بعد ان کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ان کے ٹکڑے اڑا دینا"

یزید بن معاویہ نے تخت نشینی کے ساتھ ہی متذکرہ لوگوں سے بیعت لینے کے لئے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو تاکیدی حکم بھیجا۔ ولید نے موخر الذکر دونوں "خطرناک" ہستیوں سے بیعت لینے کی فکر کی۔ واقعہ یوں ہوا:۔

"چنانچہ ولید نے حضرت امام حسینؓ اور ابن زبیرؓ کو بلا بھیجا ...... اس نے امیر معاویہ کی موت کی خبر سنا کر یزید کا حکم سنایا۔ حضرت امام حسینؓ نے اناللہ پڑھی اور امیر کے لئے دعائے خیر کی۔ پھر فرمایا: میرے جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا ...... جب عام لوگوں کو بیعت کے لئے بلاؤ گے اس وقت میں بھی آجاؤں گا ...... آپ لوٹ گئے۔ عبداللہ بن زبیرؓ ایک دن کی مہلت لے کر راتوں رات مکہ نکل گئے۔ ولید کو خبر ہوئی تو اس نے آدمی دوڑائے لیکن ابن زبیر دور جا

چکے تھے۔ مکہ پہنچ کر وہ حرم میں پناہ گزین ہو گئے۔ ؎۱

بعد میں نعمان بن بشیر نے مکہ جا کر ابن زبیر کو یزید کا یہ پیغام پہنچایا کہ میں امن و عافیت چاہتا ہوں اس لئے تم طاعت و جماعت سے الگ ہو کر اختلاف نہ پیدا کرو۔ یہ پیغام سن کر ابن زبیرؓ نے نعمان بن بشیر کے ایک اور ساتھی ابن عصاۃ سے پوچھا کہ کیا تم حرم میں خون بہانا پسند کرو گے؟ اس نے جواب دیا۔ اگر تم بیعت نہ کرو گے تو میں اس میں بھی دریغ نہ کروں گا۔

بعد کا واقعہ ہے کہ اہل حجاز نے ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور مدینہ سے تمام اموی عمال کو نکال دیا گیا۔ نتیجۃً حکومت کا اقدام واقعۂ حرہ جیسے منحوس حادثے پر منتج ہوا اور حرم مدینہ کی آخری حدوں تک توہین کی گئی۔

مدینہ کو تاراج کرنے کے بعد مسلم بن عقبہ ابن زبیرؓ کے مقابلہ کے لئے مکہ روانہ ہو گیا۔ وہ عرصہ سے بیمار تھا۔ مکہ پہنچنے سے پہلے اس کی اجل آ گئی۔ اس کا جانشین حصین بن نمیر محرم ۶۴ھ میں مکہ میں پہنچا۔ ابن زبیرؓ حرم میں پناہ گزین تھے۔ حصین نے محاصرہ کیا اور سنگ باری شروع کر دی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ ابن زبیر حرم کے اندر سے مدافعت کرتے رہے۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ یزید کا آخری وقت آ گیا۔

حرم مکہ کے خلاف یہ پہلا اقدامِ توہین تھا جو ملت اسلامیہ کے اپنے ہی وابستگان کی طرف سے عمل میں آیا۔ اس اقدام پر بھی قدرت نے دو نشان دکھا دیئے کہ ایک تو مسلم بن عقبہ کھیت رہا۔ دوسرے یزید چل بسا جس نے سارا کھیل رچایا تھا۔ بات یہاں ختم نہیں ہو گئی۔ ابھی توہین حرم کی اس داستان کی تکمیل باقی ہے۔ آگے کی بات بیان کرنے سے پہلے ایک وضاحت اشد ضروری ہے۔

حضرت امام حسینؓ کا جو نام اور مقام ہے، اس کے لحاظ سے بچہ بچہ جانتا ہے کہ اس شہید کربلا نے کیا کارنامہ سر انجام دیا۔ مگر جس مقصد کے لئے امام حسینؓ نکلے تھے، وہی عبد اللہ بن زبیرؓ کا بھی تھا۔ وہ بھی شہید ہوئے اور یہ بھی شہید ہوئے۔ اسی مقصد کے لئے محمد بن حنیفہ نے بھی حرکت کا آغاز کیا۔ یہ مختلف ہستیاں ذاتی اقتدار اور منفعت کے لئے سرگرم عمل نہ تھیں بلکہ ان سب کا منشا یہ تھا

---

؎۱: تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی ج ۲۔ ص ۴۴

کہ خلافت راشدہ نے جس نظامِ اسلامی کو حضور خاتم النبیینؐ کے بعد برقرار رکھا اسے بادشاہت میں تبدیل کرنے کے اس تاریخی عمل کو ناکام کیا جائے جو پورے زور سے شروع ہو چکا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کوئی معمولی ہستی نہیں۔ سنہ ۲ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد بہت دنوں تک کسی مہاجر کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ یہودیوں نے مشہور کر دیا کہ یہ اُن کے سحر کا نتیجہ ہے۔ [۱] خدا نے یہودیوں کے دعوے کو باطل کرنے کے لئے جس پہلی روح کو بھیجا وہ عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔ مسلمانوں نے ان کی پیدائش پر بڑی خوشی منائی۔

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور حواریٔ رسولؐ حضرت زبیر بن العوام کے صاحبزادے تھے ان کی والدہ حضرت اسماء حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بڑی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ سات آٹھ سال کی عمر میں انہوں نے حضورؐ کے دستِ سعادت پر بیعت کی۔ بچپن سے بڑے شجاع اور حوصلہ مند تھے۔ شروع ہی سے بڑائی کے آثار ان میں نمایاں تھے۔ سن شعور کے بعد وہ اکثر مہمات میں شریک رہے۔ طرابلس انہی کی کوششوں سے فتح ہوا۔[۲]

نظامِ اسلام کو مسخ کر کے عجمی بادشاہت اور رنگین ثقافت کے سانچے میں ڈھالنے کی مساعی کے خلاف جب عبداللہ بن زبیر اٹھے تو حجاز والوں کے علاوہ عراق، مصر اور شام میں بھی بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ اور بعض مقامات پر ان کے مامور کردہ عامل کام کرنے لگے۔

تاریخی داستان تو خاصی لمبی ہے مگر ہم دیگر تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے موضوع کے تقاضوں کی طرف

---

[۱] جادوگر حقیقی ہوں یا غیر حقیقی دونوں صورتوں میں وہ اپنے حریف یا معتوب کو نفسیاتی ضربیں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو کوئی نفسیاتی مار کھا گیا وہ جادو کا شکار ہوا۔ اور جو بچ نکلا سو بچ نکلا۔ یہاں کوئی باقاعدہ سلسلۂ علت و معلول تو ہوتا نہیں۔ تیر تکے چلتے ہیں۔ سو گاہ باشد کہ کودکِ ناداں، بہ غلط بر ہدف زند تیرے۔ جادوگروں کی مارکیٹ بھی اسی طرح بنتی ہے کہ مشکلات میں مصائب کے لمحوں سے دو چار لوگ جب مادی اور طبعی تدبیروں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو وہ خدا تعالیٰ سے خصوصی استمداد کی جگہ جادوگروں اور نجومیوں اور فال گیروں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہودیوں نے مسلمانوں پر اپنے سحر کا نفسیاتی سکہ چلانا چاہا مگر ان پکے خدا پرستوں پر نہ چل سکا۔ (ن۔ص)

[۲] تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ج۔ ۲۔ ص: ۶۷

آتے ہیں۔

مصعب کے قتل اور عراق پر عبدالملک کے قبضہ کے بعد ابن زبیر کی مالی حالت اور فوجی قوت کمزور ہو گئی۔ اس لیے عبدالملک (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے لیے آسان ہو گیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کو زیر کریں۔

۷۲ھ میں عبدالملک نے حجاج بن یوسف ثقفی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ابن زبیرؓ کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ وہ حرم مکہ میں پناہ گزیں تھے۔ حجاج نے مکہ کا محاصرہ کر کے سنگ باری شروع کر دی، کئی مہینہ تک مسلسل محاصرہ قائم رہا۔ بڑی شدت سے سنگ باری ہوتی رہی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ ابن زبیرؓ بڑی شجاعت سے لڑتے رہے لیکن ان کی مدد کے تمام راستے بند تھے۔ سامانِ رسد ختم ہو گیا۔ پورے مکہ میں سخت قحط پڑ گیا۔ ان حالات میں ابن زبیرؓ کے دس ہزار آدمی حجاج سے جا ملے۔ آخر میں جناب ابن زبیرؓ کے لڑکوں نے بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔

عبدالملک جناب ابن زبیرؓ کے ساتھ رعایت برتنے کے لیے تیار تھا۔ جب مقابلہ جاری رکھنا بالکل ممکن نہ رہا تو عبداللہ بن زبیرؓ اپنی والدہ کے پاس تشریف لے گئے۔ عرض کی کہ تمام ساتھی الگ ہو گئے، میرے لڑکے بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ جو چند جاں نثار باقی ہیں ان میں بھی مقابلہ کی تاب نہیں۔ دشمن رعایت کرنے کو تیار ہے۔ آپ کیا فرماتی ہیں؟

اس موقع پر حضرت اسماءؓ نے ایک مسلم ماں کی حیثیت میں جو جواب دیا وہ بڑا زندگی افروز ہے فرمایا۔

"بیٹا! تم کو اپنی حالت کا اندازہ خود ہوگا۔ اگر تم حق پر ہو اور حق کے لیے لڑتے ہو تو اب بھی اس کے لیے لڑو کہ تمہارے بہت سے ساتھیوں نے اس کے لیے جان دی ہے اور اگر دنیا طلبی کے لیے لڑتے ہو تو تم سے بُرا کون خدا کا بندہ ہوگا کہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ کتنوں کو ہلاک کیا۔ اور اگر یہ عذر ہے کہ حق پر ہو لیکن اپنے مددگاروں کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہو تو یاد رکھو، شریفوں اور دینداروں کا یہ شیوہ نہیں ہے۔ تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے۔ جاؤ حق پر جان دینا۔ دنیا کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سن کر ابن زبیرؓ نے کہا: اماں! مجھے خوف ہے کہ میرے قتل کے بعد بنی امیہ میری لاش کو مثلہ کر کے سولی پر لٹکائیں گے۔ بہادر ماں نے جواب دیا: ذبح ہو جانے کے بعد بکری کو کھال کھینچنے سے تکلیف نہیں ہوتی۔ جاؤ خدا سے مدد مانگ کر اپنا کام

پورا کر دے۔[1]

والدہ سے رخصت ہو کر وہ سیدھے رزمگاہ پہنچے اور بڑی شجاعت و بہادری کے ساتھ لڑے۔ حملہ آور اُن سے لڑتے لڑتے حرم کے پھاٹک تک ان کو دھکیل کے لے گئے، یہاں تک کہ مجاہدِ حق نے شہادت پائی۔ یہ واقعہ سنہ ۳ھ کا ہے۔

---

عباسی حکومت کے دورِ انحطاط میں ابوطاہر بن ابوسعید نے مہدویت کا دعویٰ کیا اور ہجر، احسا، قطیف، طائف اور بحرین پر حکومت جمائی۔ اُس نے بصرہ کو تباہ کیا۔ پھر خود اسلام پر حملہ آور ہوا۔ سنہ ۳۱۲ھ میں حاجیوں کو لوٹنے کا سلسلہ شروع کیا جن میں سے بہت سے شہید ہوئے۔ عباسی حکومت نے کئی بار کارروائیاں کیں مگر ناکامی ہوئی۔ عباسی خلافت کی طرف سے ابن قیس کو سپہ سالار بنا کر ابوطاہر کے خلاف فوج کشی کے لیے بھیجا گیا۔ مگر شکست کھائی۔ اس موقع پر ابوطاہر کو پہلی بار ہزیمت اٹھانی پڑی۔

ابوطاہر نے ہجر کو دارالحکومت بنایا۔ وہاں ایک مسجد تعمیر کی جسے دارالہجرت کے نام سے موسوم کیا۔ اس نے چاہا کہ لوگ کعبہ کو چھوڑ کر دارالہجرت کا حج کریں۔ اس غرض کے لیے حجر اسود کو اکھیڑ لانے کی اسکیم بنائی۔ اور ۳۱۹ھ کو مکہ کی طرف کوچ کیا۔ یوم ترویہ کو مکہ پہنچا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر برہنہ تلوار لیے مسجد حرام میں داخل ہوا۔ یہاں شراب نوشی کی۔ ایک ہزار سات سو حاجیوں کو شہید کیا۔ کعبہ معلّیٰ کا دروازہ اکھڑوا دیا۔ امیر مکہ شرفاء کو ساتھ لے کر نصیحت و سفارش کے لیے آیا۔ اُسے بھی قتل کرا دیا۔

سنہ ۳۱۷ھ میں ابوطاہر حجر اسود خانہ کعبہ سے اکھیڑ کر لے گیا۔ اُس کے ظلم کی وجہ سے دس سال تک حج منقطع رہا۔ مگر حاجیوں کو دارالہجرت میں لانے میں اُسے بالکل ناکامی ہوئی۔ تب مکہ کے حاجیوں پر ٹیکس لگا دیا۔

خلیفۂ وقت مقتدر باللہ نے ۵۰ ہزار درہم حجر اسود حاصل کرنے کے لیے پیش کیے۔ ابوطاہر نہ مانا۔ بعد میں خلیفہ مطیع اللہ سے تیس ہزار دینار لے کر حجر اسود واپس کیا۔ ۱۰ محرم سنہ ۳۳۹ھ کو حجر اسود مکہ واپس پہنچا اور شبیر بن حسین قرمطی نے اُسے اصلی جگہ پر نصب کر دیا۔

ابوطاہر چیچک میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔

(باقی بر صفحہ ۱۴۸)

---

[1] بحوالہ تاریخ مذکور۔ ج ۲۔ ص ۔ ۸۸ - ۸۹

## ایک ضروری اعلان

# ترجمان القرآن ــــ کا ــــ سیّد مودودی غفرلہٗ نمبر

ابھی یہ اوّلین اعلان محض اطلاعی نوعیت کا ہے۔ اشاعتِ خاص کا تفصیلی منصوبہ ضروری مشاورت کے بعد بنے گا۔ اور اس سلسلے میں جو معلومات بھی سامنے لانی ہوں گی، لائی جائیں گی، نیز ماہِ اشاعت کا فیصلہ بھی بعد میں ہوگا۔ اتنی بات البتہ واضح رہنی چاہیے کہ یہ نمبر اخبارون اور رسائل کے پیش کردہ نمبروں سے ذرا مختلف ہوگا۔ اور اس میں بطورِ خاص لکھوائے ہوئے معیاری مقالات، سنجیدہ مضامین، حالاتِ زندگی، خود سیّد مودودی کی تحریریں، اقتباسات اور خطوط وغیرہ پیش کیے جائیں گے۔

قارئین ترجمان القرآن اور جملہ محبّانِ مودودی سے درخواست ہے کہ وہ ادارہ سے حسبِ ذیل صورتوں میں تعاون کریں:-

۱- مجوزہ اشاعت کے متعلق جو تجاویز یا مفید معلومات آپ کے سامنے ہوں، لکھ بھیجیں۔

۲- مولینائے مغفور کے قلم سے لکھے ہوئے خطوط یا کسی طرح کی کوئی تحریر یا کوئی مسودہ آپ کے پاس ہو تو چاہیں تو وہ اُس کی فوٹو سٹیٹ کاپی ہوا کر بھجوا دیں اور چاہیں تو اصل بذریعہ رجسٹری ہمیں روانہ کر دیں تاکہ ہم فوٹو کاپی لے کر اصل واپس کر دیں۔

۳- جن اصحاب کو مولینا کے حالاتِ زندگی اور سوانح کے کسی خاص پہلو کی معلومات حاصل ہوں، وہ اشاعتِ خاص کے لیے لکھ بھیجیں۔

۴- جن اصحاب کو مولینا سے مل کر، یا خط و کتابت کرتے ہوئے کوئی خاص تجربہ ہوا ہو، یا جنہیں کسی اہم امر کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہو، یا جن کے پاس کوئی یادگاری چیز موجود ہو، وہ ہمیں مطلع فرما دیں۔

۵- جن اصحاب نے مولینا مودودی کی دعوت سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدلی ہیں، ان میں سے جس کسی کو کوئی غیر معمولی صورت پیش آئی ہو، وہ روئیداد تحریر فرما دیں۔ وہ تجربات بھی اسی ذیل میں آتے

ہیں کہ مولینا کی میزبانی، ہم سفری یا جیل میں اُن کی رفاقت، یا اُن کے علاج معالجے یا کسی ہسپتال میں اُن کی تیمارداری، یا جلسوں اور علماء یا سیاسی لیڈروں کی مشترک مجالس میں اُن کی شرکت کی صورتوں میں پیش آئے ہوں۔

ہماری دلی تمنا ہے کہ:۔

سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ اپنا رسالہ جس کو ۱۹۳۲ء میں انہوں نے احیائے اسلام کی تحریک برپا کرنے کا ذریعہ بنایا، جس رسالے نے ہزاروں زندگیوں کے نقشے بدل دیئے اور جس کے ساتھ آخر دم تک اُن کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا، سید مودودی مغفور کا سب سے بڑھ کر اس پر یہ حق آتا ہے کہ وہ مغفور کا شایانِ شان یادگاری نمبر پیش کرے۔

ادارہ کے تمام کارکنان یہ کام بہ نیت ثواب کریں گے، اور جو کوئی جس درجے میں بھی اپنا حصہ اس میں ادا کرے گا، عند اللہ اجر حاصل کرے گا۔

(ادارہ ترجمان القرآن)

---

(بقیہ اشارات صفحہ ۴۶)

اور اب آخری مرتبہ توہین حرم کا ایک افسوسناک واقعہ ........ عین یکم محرم ۱۳۹۹ھ کو سامنے آیا حالانکہ یہ دن سال کے آغاز کا دن بھی تھا اور اس دن سے وہ دو سالہ دور شروع ہو رہا تھا جس سے پندرھویں صدی کی آمد کی خوشی منائی جانی تھی اور آئندہ کے لئے ملتِ اسلامیہ کو اتحاد و اقدام کے عزائم استوار کرنے تھے اس واقعہ نے ہمارے اس دورِ مبارک کی گویا صبح کو داغدار کر دیا۔

سیاسی نزاعات، فرقوں کے منافشات اور قبیلوں یا نسلوں اور قوموں کی عصبیتوں سے حدودِ حرم کو پاک رہنا چاہیئے۔

خاتمہ گفتگو اس بات پہ کرتا ہوں کہ حالیہ حادثہ توہینِ حرم کے بہت سے پہلو قابلِ غور ہیں محض توہینِ حرم کی جذباتی فضا کے اندر ہی قابلِ توجہ حقائق کو نہیں چھپانا چاہیئے۔ بہت سی اصطلاحات اور تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

ہو سکا تو اشاعتِ آئندہ میں چند خیر خواہانہ نکات عرض کیے جائیں گے۔

---